انسانی کوتاہیاں

گذشتہ صفحات میں خالص علمی تحقیق اور سائنٹفک مشاہدات و تجربات کی مدد سے ہم نے یہ دکھانے کی کوشش کی ہے کہ اگر انسانی فطرت کے مقتضیات اور انسان کی ذہنی افتاد اور جسمانی ساخت کی تمام دلالتوں کا لحاظ کر کے تمدن کا ایک صحیح نظام مرتب کیا جائے تو صنفی معاملات کی حد تک اسکے ضروری اصول و ارکان کیا ہونے چاہئیں۔ اس بحث میں کوئی چیز ایسی بیان نہیں کی گئی ہے جو متشابہات میں سے ہو، یا جس میں کسی کلام کی گنجائش ہو۔ جو کچھ کہا گیا ہے وہ علم و حکمت کے محکمات میں سے ہے اور عموماً سب ہی اہل علم و عقل اس سے واقف ہیں۔ لیکن انسانی عجز کا کمال دیکھیے کہ جتنے نظام تمدن خود انسان نے وضع کیے ہیں ان میں سے ایک میں بھی فطرت کی ان معلوم و معروف ہدایات کو بہ تمام و کمال اور بحسن تناسب ملحوظ نہیں رکھا گیا ہے۔ یہ تو ظاہر ہے کہ انسان خود اپنی فطرت کے مقتضیات سے ناواقف نہیں ہے اُس سے خود اپنی ذہنی کیفیات اور جسمانی خصوصیات چھپی ہوئی نہیں ہیں۔ مگر اسکے باوجود یہ حقیقت بالکل عیاں ہے کہ آج تک وہ کوئی ایسا معتدل نظام تمدن وضع کرنے میں کامیاب ہو سکا جسکے اصول و مناہج میں پورے توازن کے ساتھ ان سب مقتضیات و خصوصیات اور سب مصالح و مقاصد کی رعایت کی گئی ہو۔

نارسائی کی حقیقی علت اس کی وجہ وہی ہے جسکی طرف ہم اس کتاب کی ابتدا میں اشارہ کر چکے ہیں۔ انسان کی یہ فطری کمزوری ہے کہ اسکی نظر کسی معاملے کے تمام پہلوؤں پر من حیث الکل حاوی نہیں ہو سکتی۔ ہمیشہ کوئی ایک پہلو اسے زیادہ اپیل کرتا ہے اور اپنی طرف کھینچ لیتا ہے۔ پھر جب وہ ایک طرف مائل ہو جاتا ہے تو دوسرے اطراف یا تو اسکی نظر سے بالکل ہی اوجھل ہو جاتے ہیں یا وہ قصداً ان کو نظر انداز کر دیتا ہے۔ زندگی کے جزئی اور انفرادی معاملات تک میں انسان کی یہ کمزوری نمایاں نظر آتی ہے۔ پھر کیسے ممکن ہے کہ تمدن و تہذیب

کے وسیع تر مسائل، جن میں سے ہر ایک اپنے اندر بے شمار جلی و خفی گوشے رکھتا ہے، اس کمزوری کے اثر سے محفوظ رہ جائیں۔ علم اور عقل کی دولت سے انسان کو ضرور سرفراز کیا گیا ہے، مگر عموماً زندگی کے معاملات میں خالص عقلیت اسکی رہنما نہیں ہوتی۔ جذبات اور رجحانات پہلے اسکو ایک رُخ پر موڑ دیتے ہیں، پھر جب وہ اس خاص رُخ کی طرف متوجہ ہو جاتا ہے تب عقل سے استدلال کرتا ہے اور علم سے مدد لیتا ہے۔ اس حالت میں اگر خود اسکا علم اسکو معاملے کے دوسرے رُخ دکھائے اور اسکی اپنی عقل اسکی یک رُخی پر متنبہ کرے تب بھی وہ اپنی غلطی تسلیم نہیں کرتا بلکہ علم و عقل کو مجبور کرتا ہے کہ اسکے رجحان کی تائید میں دلائل اور تاویلات فراہم کریں۔

چند نمایاں مثالیں معاشرت کے جس مسئلے سے اس وقت ہم بحث کر رہے ہیں، اس میں انسان کی یہی یک رُخی اپنی افراط و تفریط کی پوری شان کے ساتھ نمایاں ہوئی ہے۔

ایک گروہ اخلاق اور روحانیت کے پہلو کی طرف جھکا اور اس میں یہاں تک غلو کر گیا کہ عورت اور مرد کے صنفی تعلق ہی کو سرے سے ایک قابلِ نفرت چیز قرار دے بیٹھا۔ یہ بے اعتدالی ہم کو بودھ مت، مسیحیت اور بعض ہندو مذاہب میں نظر آتی ہے۔ اور اسی کا اثر ہے کہ ابتک دنیا کے ایک بڑے حصہ میں صنفی تعلق کو بجائے خود ایک بدی سمجھا جاتا ہے عام اس سے کہ وہ ازدواج کے دائرہ میں ہو یا اس سے باہر۔ اس کا نتیجہ کیا ہوا؟ یہ کہ رہبانیت کی غیر فطری اور غیر متمدن زندگی کو اخلاق اور طہارت نفس کا نصب العین سمجھا گیا۔ نوع انسانی کے بہت سے افراد نے جن میں مرد بھی ہیں اور عورتیں بھی اپنی ذہنی اور جسمانی قوتوں کو فطرت سے انحراف بلکہ جنگ میں ضائع کر دیا۔ اور جو لوگ اقتضائے فطرت سے مجبور ہو کر باہم ملے بھی تو اس طرح جیسے کوئی شخص مجبوراً اپنی کسی گندی ضرورت کو پورا کرتا ہے۔ ظاہر ہے کہ اس قسم کا تعلق نہ تو زوجین کے درمیان محبت اور تعاون کا تعلق بن سکتا ہے اور نہ اس سے کوئی صالح اور ترقی پذیر تمدن وجود میں آسکتا ہے۔ یہی نہیں بلکہ نظام معاشرت میں عورت کے مرتبہ کو گرانے کی ذمہ داری بھی بڑی حد تک اسی نام نہاد اخلاقی تصور پر ہے۔ رہبانیت کے پرستاروں نے صنفی

کشش کو شیطانی وسوسہ، اور اس کشش کی محرک، یعنی عورت کو شیطان کا ایجنٹ قرار دیا، اور اس کو ایک ایسا ناپاک وجود ٹھیرایا جس سے نفرت کرنا ہر اس شخص کے لیے ضروری ہے جو طہارت نفس چاہتا ہو۔ مسیحی، بودھ اور ہندو لٹریچر میں عورت کا یہی تصور غالب ہے اور جو نظام معاشرت اس تصور کے تحت مرتب کیا گیا ہو اس میں عورت کا جیسا کچھ مرتبہ ہو سکتا ہے، اس کا اندازہ لگانا کچھ مشکل نہیں۔

اس کے برعکس دوسرے گروہ نے انسان کے داعیات جسمانی کی رعایت کی تو اس میں اتنا غلو کیا کہ فطرت انسانی تو درکنار، فطرت حیوانی کے مقتضیات کو بھی نظر انداز کر دیا۔ مغربی تمدن میں یہ کیفیت اس قدر نمایاں ہو چکی ہے کہ اب چھپائے نہیں چھپ سکتی۔ اسکے قانون میں زنا کوئی جرم ہی نہیں، جرم اگر ہے تو جبر و اکراہ ہے یا کسی دوسرے شخص کے قانونی حق میں مداخلت۔ ان دونوں میں سے کسی جرم کی مشارکت نہ ہو تو زنا (یعنی صنفی تعلقات کا انتشار) بجائے خود کوئی قابل تعزیر جرم، حتی کہ کوئی قابل شرم اخلاقی عیب بھی نہیں۔ یہاں تک تو وہ کم از کم حیوانی فطرت کی حد میں تھا۔ لیکن اسکے بعد وہ اس سے بھی آگے بڑھا۔ اس نے صنفی تعلق کے حیوانی مقصد یعنی تناسل اور بقائے نوع کو بھی نظر انداز کر دیا، اور اسے محض جسمانی لطف و لذت کا ذریعہ بنا لیا۔ یہاں پہنچ کر وہی انسان جو احسن تقویم پر پیدا کیا گیا تھا، اسفل سافلین میں پہنچ جاتا ہے۔ پہلے وہ اپنی انسانی فطرت سے انحراف کر کے حیوانات کا سا مقصد صنفی تعلق اختیار کرتا ہے جو کسی تمدن کی بنیاد نہیں بن سکتا۔ پھر وہ اپنی حیوانی فطرت سے بھی انحراف کرتا ہے اور اس تعلق کے فطری نتیجہ، یعنی اولاد کی پیدائش کو بھی روک دیتا ہے، تاکہ دنیا میں اسکی نوع کو باقی رکھنے والی نسلیں وجود ہی میں نہ آنے پائیں۔

ایک جماعت نے خاندان کی اہمیت کو محسوس کیا تو اسکی تنظیم اس قدر سخت بندشوں کے ساتھ کی کہ ایک ایک فرد کو جکڑ کر رکھ دیا اور حقوق و فرائض میں کوئی توازن ہی باقی نہ رکھا۔ اسکی ایک نمایاں مثال ہندوؤں کا خاندانی نظام ہے۔ اس میں عورت کے لیے ارادے اور عمل کی کوئی آزادی نہیں۔ تمدن اور معیشت میں اس کا کوئی حق نہیں۔ وہ لڑکی ہے تو لونڈی ہے۔ بیوی ہے تو لونڈی ہے۔ ماں ہے تو لونڈی ہے۔

بیوہ ہے تو لونڈی سے بھی بدتر زندہ درگور ہے۔ اسکے حصہ میں صرف فرائض ہی فرائض ہیں، حقوق کے خانے میں ایک عظیم الشان صفر کے سوا کچھ نہیں۔ اس نظام معاشرت میں عورت کو ابتدا ہی سے ایک بے زبان جانور بنانے کی کوشش کی جاتی ہے تاکہ اس میں سرے سے اپنی خودی کا کوئی شعور پیدا ہی نہ ہو۔ بلاشبہ اس طریقہ سے خاندان کی بنیادوں کو بہت مضبوط کر دیا گیا اور عورت کی بغاوت کا کوئی امکان باقی نہ رہا۔ لیکن جماعت کے پورے نصف حصہ کو ذلیل اور پست کر کے اس نظام معاشرت نے درحقیقت اپنی تعمیر میں خرابی کی ایک صورت اور بڑی خطرناک صورت پیدا کر دی جسکے نتائج کو اب خود ہندو بھی محسوس کر رہے ہیں۔

ایک دوسری جماعت نے عورت کے مرتبے کو بلند کرنے کی کوشش کی اور اسکو ارادہ و عمل کی آزادی بخشی تو اس میں اتنا غلو کیا کہ خاندان کا شیرازہ ہی درہم برہم کر دیا۔ بیوی ہے تو آزاد۔ بیٹی ہے تو آزاد۔ بیٹا ہے تو آزاد۔ خاندان کا درحقیقت کوئی سر دھرا نہیں۔ کسی کو کسی پر اقتدار نہیں۔ بیوی سے شوہر نہیں پوچھ سکتا کہ تو نے رات کہاں بسر کی۔ بیٹی سے باپ نہیں پوچھ سکتا کہ تو کس سے ملتی ہے اور کہاں جاتی ہے۔ زوجین درحقیقت دو برابر کے دوست ہیں جو مساوی شرائط کے ساتھ مل کر ایک گھر بناتے ہیں، اور اولاد کی حیثیت اس ایسوسی ایشن میں محض جونیر ممبرس کی سی ہے۔ مزاج اور طبائع کی ایک ادنیٰ ناموافقت اس بنے ہوئے گھر کو ہر وقت بگاڑ سکتی ہے، کیونکہ اطاعت کا ضروری عنصر، جو ہر نظم کو برقرار رکھنے کے لیے ناگزیر ہے، اس جماعت میں سرے سے موجود ہی نہیں۔ یہ مغربی معاشرت ہے، اور یہی مغربی معاشرت جسکے علمبردار اس کو اصول تمدن و عمران میں پیغمبری کا دعویٰ ہے۔ انکی پیغمبری کا صحیح حال آپکو دیکھنا ہو تو یورپ اور امریکہ کی کسی عدالت نکاح و طلاق یا کسی عدالت جرائم اطفال (Juvenile Court) کی روداد اٹھا کر دیکھ لیجیے۔ ابھی حال میں انگلستان کے ہوم آفس سے جرائم کے جو اعداد و شمار شائع ہوئے ہیں ان سے معلوم ہوتا ہے کہ کم سن لڑکوں اور لڑکیوں میں جرائم کی تعداد روز بروز بڑھتی چلی جا رہی ہے، اور اس کی خاص وجہ یہ بیان کی گئی ہے کہ خاندان کا ڈسپلن بہت کمزور ہو گیا ہے۔ (ملاحظہ ہو Blue Book of Crime Statistics for 1934

انسان اور خصوصاً عورت کی فطرت میں شرم وحیا کا جو مادہ رکھا گیا ہے اسکو ٹھیک ٹھیک سمجھنے اور عملاً لباس اور طرز معاشرت کے اندر اسکی صحیح ترجمانی کرنے میں تو کسی انسانی تمدن کو کامیابی نہیں ہوئی شرم وحیا کو انسان اور خاص کر عورت کی بہترین صفات میں سے شمار کیا گیا ہے۔ مگر لباس و معاشرت میں اس کا ظہور کسی عقلی طریقے اور کسی ہموار ضابطہ کی صورت میں نہیں ہوا۔ ستر عورت کے صحیح حدود متعین کرنے اور یکسانی کے ساتھ انکو ملحوظ رکھنے کی کسی نے کوشش نہیں کی۔ مردوں اور عورتوں کے لباس اور انکے آداب و اطوار میں حیا داری کی صورتیں کسی اصول کے تحت مقرر نہیں کی گئیں۔ معاشرت میں مرد اور مرد، عورت اور عورت، مرد اور عورت کے درمیان کشف وحجاب کی مناسب اور معقول حد بندی کی ہی نہیں گئی۔ تہذیب و شائستگی اور اخلاق عامہ کے نقطۂ نظر سے یہ معاملہ جتنا اہم تھا، اتنا ہی اسکے ساتھ تغافل برتا گیا۔ اسکو کچھ تو رسم و رواج پر چھوڑ دیا گیا، حالانکہ رسم و رواج اجتماعی حالات کے ساتھ بدل جانے والی چیز ہے، اور کچھ افراد کے ذاتی رجحان و انتخاب پر منحصر کر دیا گیا، حالانکہ نہ جذبۂ شرم وحیا کے اعتبار سے تمام اشخاص یکساں ہیں اور نہ ہر شخص اتنی سلامت ذوق اور صحیح قوت انتخاب رکھتا ہے کہ اپنے اس جذبہ کے لحاظ سے خود کوئی مناسب طریقہ اختیار کر سکے۔ اسی کا نتیجہ ہے کہ مختلف جماعتوں کے لباس اور معاشرت میں حیاداری اور بے حیائی کی عجیب آمیزش نظر آتی ہے جس میں کوئی عقلی مناسبت، کوئی یکسانی، کوئی ہمواری، کسی اصول کی پابندی نہیں پائی جاتی۔ مشرقی ممالک میں تو یہ چیز صرف بے ڈھنگے پن ہی تک محدود رہی۔ لیکن مغربی قوموں کے لباس اور معاشرت میں جب بے حیائی کا عنصر حد سے زیادہ بڑھا تو انہوں نے سرے سے شرم وحیا کی جڑ ہی کاٹ دی۔ ان کا جدید نظریہ یہ ہے کہ "شرم وحیا دراصل کوئی فطری جذبہ ہی نہیں ہے بلکہ محض لباس پہننے کی عادت نے اسکو پیدا کر دیا ہے۔ ستر عورت اور حیاداری کا کوئی تعلق اخلاق اور شائستگی سے نہیں ہے بلکہ وہ تو درحقیقت انسان کے داعیات صنفی کو تحریک دینے والے اسباب میں سے ایک سبب ہے"[1] اسی فلسفۂ بے حیائی کی عملی تفسیریں ہیں وہ نیم عریاں

[1] یہ لفظ بلفظ وہی خیال ہے جو ویسٹرمارک (Westermarck) نے اپنی کتاب (The History of Human Marriage) میں ظاہر کیا ہے۔

لباس، وہ جسمانی حسن کے مقابلے، وہ برہنہ ناچ، وہ ننگی تصویریں، وہ اسٹیج پر فحاشانہ مظاہرے، وہ برہنگی (Nudism) کی روز افزوں تحریک، وہ حیوانیتِ محض کی طرف انسان کی واپسی۔

یہی بے اعتدالی اس مسئلہ کے دوسرے اطراف میں بھی نظر آتی ہے:

جن لوگوں نے اخلاق اور عصمت کو اہمیت دی انہوں نے عورت کی حفاظت ایک جاندار، ذی عقل، ذی روح وجود کی حیثیت سے نہیں کی، بلکہ ایک بے جان زیور، ایک قیمتی پتھر کی طرح کی، اور اسکی تعلیم و تربیت کے سوال کو نظر انداز کر دیا، حالانکہ تہذیب و تمدن کی بہتری کے لیے یہ سوال عورت کے حق میں بھی اتنا ہی اہم تھا جتنا مرد کے لیے تھا۔ بخلاف اسکے جنہوں نے تعلیم و تربیت کی اہمیت کو محسوس کیا انہوں نے اخلاق اور عصمت کی اہمیت کو نظر انداز کر کے ایک دوسری حیثیت سے تمدن و تہذیب کی تباہی کا سامان مہیا کر دیا۔

جن لوگوں نے فطرت کی تقسیم عمل کا لحاظ کیا انہوں نے تمدن و معاشرت کی خدمات میں سے عورت پر صرف خانہ داری اور تربیت اطفال کی ذمہ داریاں عائد کیں اور مرد پر رزق مہیا کرنے کا بار ڈالا۔ لیکن اس تقسیم میں وہ توازن برقرار نہ رکھ سکے۔ انہوں نے عورت سے تمام معاشی حقوق سلب کر لیے۔ وراثت میں اسکو کسی قسم کا حق نہ دیا، ملکیت کے تمام حقوق مرد کی طرف منتقل کر دیے، اور اس طرح معاشی حیثیت سے عورت کو بالکل بے دست و پا کر کے عورت اور مرد کے درمیان درحقیقت لونڈی اور آقا کا تعلق قائم کر دیا۔ اسکے مقابلہ میں ایک دوسرا گروہ اٹھا جس نے اس بے انصافی کی تلافی کرنی چاہی، اور عورت کو اسکے معاشی و تمدنی حقوق دلانے کا ارادہ کیا، مگر یہ لوگ ایک دوسری غلطی کے مرتکب ہو گئے۔ انکے دماغوں پر مادیت کا غلبہ تھا اس لیے انہوں نے عورت کو معاشی و تمدنی غلامی سے نجات دلانے کے معنی یہ سمجھے کہ اسکو بھی مرد کی طرح خاندان کا کمانے والا فرد بنا دیا جائے، اور تمدن کی ساری ذمہ داریوں کو سنبھالنے میں مرد کے ساتھ برابر شریک کیا جائے۔ مادیت کے نقطۂ نظر سے اس طریقہ میں بڑی جاذبیت تھی، کیونکہ اس سے نہ صرف مرد کا بار ہلکا ہو گیا بلکہ کسب معیشت میں عورت کے شریک ہو جانے سے دولت کے حصول اور اسباب عیش کی فراہمی میں قریب قریب دوچند کا اضافہ

بھی ہوگیا۔ مزید براں قوم کی معاشی اور عمرانی مشین کو چلانے کے لیے پہلے کے مقابلے میں دوگنے ہاتھ اور دوگنے دماغ مہیا ہو گئے جس سے یکایک تمدن کے ارتقار کی رفتار تیز ہوگئی۔ لیکن مادّی اور معاشی پہلو کی طرف اس قدر حد سے زیادہ مائل ہو جانے کا لازمی نتیجہ یہ ہوا کہ دوسرے پہلو جو درحقیقت اپنی اہمیت میں اس ایک پہلو سے کچھ کم نہ تھے، ان کی نگاہوں سے اوجھل ہو گئے اور بہت سے پہلوؤں کو انہوں نے جانتے بوجھتے نظرانداز کر دیا۔ انہوں نے قانون فطرت کو جاننے کے باوجود قصداً اسکی خلاف ورزی کی جسپر خود انکی اپنی سائنٹیفک تحقیقات شہادت دے رہی ہے۔ انہوں نے عورت کے ساتھ انصاف کرنیکا دعویٰ کیا مگر درحقیقت بے انصافی کے مرتکب ہوئے جس پر خود ان کے اپنے مشاہدات اور تجربات گواہ ہیں۔ انہوں نے عورت کو مساوات دینے کا ارادہ کیا مگر درحقیقت نامساوات قائم کر بیٹھے جسکا ثبوت خود ان کے اپنے علوم و فنون فراہم کر رہے ہیں۔ انہوں نے تمدن و تہذیب کی اصلاح کرنی چاہی، مگر درحقیقت اسکی تخریب کے نہایت خوفناک اسباب پیدا کر دیے جنکی تفصیلات خود انہی کے بیان کردہ واقعات اور خود ان کے اپنے فراہم کردہ اعداد و شمار سے ہم کو معلوم ہوئی ہیں۔ ظاہر ہے کہ وہ ان حقائق سے بے خبر نہیں ہیں، مگر جیسا کہ ہم اوپر بیان کر چکے ہیں، یہ انسانی کمزوری ہے کہ وہ خود اپنی زندگی کے لیے قانون بنانے میں تمام مصلحتوں کی معتدل اور متناسب رعایت ملحوظ نہیں رکھ سکتا۔ ہوائے نفس اسکو افراط کے کسی ایک رخ پر بہالے جاتی ہے، اور جب وہ بہہ جاتا ہے تو بہت سی مصلحتیں اسکی نظر سے چھپ جاتی ہیں، اور بہت سی مصلحتوں اور حقیقتوں کو دیکھنے اور جاننے کے باوجود وہ انکی طرف سے آنکھیں بند کر لیتا ہے۔ اس قصدی و ارادی اندھے پن کے ثبوت میں ہم اس سے زیادہ کچھ نہیں کر سکتے کہ خود ایک ایسے اندھے ہی کی شہادت پیش کر دیں۔ روس کا ایک ممتاز سائنس داں انتون نیملاف (Anton Nemilov) جو سوفیصدی کمیونسٹ ہے اپنی کتاب (The Biological Tragedy of Woman)[1] میں سائنس کے تجربات اور مشاہدات سے خود ہی عورت اور مرد کی فطری نامساوات ثابت کرنے پر تقریباً دو سو صفحے سیاہ کرتا ہے، مگر پھر خود ہی اس تمام سائنٹیفک تحقیق کے بعد لکھتا ہے:-

[1] اس کتاب کا انگریزی ترجمہ لندن سے ۱۹۳۲ء میں شائع ہوا ہے۔ ۵۲

"آج کل اگر یہ کہا جائے کہ عورت کو نظام اجتماعی میں محدود حقوق دیے جائیں تو کم آدمی اسکی تائید کرینگے۔ ہم خود اس تجویز کے سخت مخالف ہیں۔ مگر ہمیں اپنے نفس کو یہ دھوکا نہ دینا چاہیے کہ مساواتِ مرد و زن کو عملی زندگی میں قائم کرنا کوئی سادہ اور آسان کام ہے۔ دنیا میں کہیں بھی عورت اور مرد کو برابر کر دینے کی اتنی کوشش نہیں کی گئی جتنی سوویٹ روس میں کی گئی ہے۔ کسی جگہ اس باب میں اس قدر غیر متعصبانہ اور فیاضانہ قوانین نہیں بنائے گئے۔ مگر اسکے باوجود واقعہ یہ ہے کہ عورت کی حقیقی پوزیشن خاندان میں بہت کم بدل سکی ہے" (صفحہ ۷۶)

نہ صرف خاندان میں بلکہ سوسائیٹی میں بھی :-

"اب تک عورت اور مرد کی نامساوات کا تخیل، نہایت گہرا تخیل، نہ صرف ان طبقوں میں جو ذہنی حیثیت سے ادنیٰ درجہ کے ہیں، بلکہ اعلیٰ درجہ کے تعلیم یافتہ سوویٹ طبقوں میں بھی جما ہوا ہے، اور خود عورتوں میں اس تخیل کا اتنا گہرا اثر ہے کہ اگر انکے ساتھ ٹھیٹھ مساوات کا سلوک کیا جائے تو وہ اس کو مرد کے مرتبہ سے گرا ہوا سمجھینگی، بلکہ اسے مرد کی کمزوری اور نامردی پر محمول کرینگی۔ اگر ہم اس معاملہ میں کسی سائنٹسٹ، کسی مصنف، کسی طالب علم، کسی تاجر، یا کسی سوفیصدی کمیونسٹ کے خیالات کا تجسس کریں تو بہت جلدی یہ حقیقت منکشف ہو جائیگی کہ وہ عورت کو اپنے برابر کا نہیں سمجھتا۔ اگر ہم زمانۂ حال کے کسی ناول کو پڑھیں، خواہ وہ کیسے ہی آزاد خیال مصنف کا لکھا ہوا ہو، یقیناً اس میں ہم کو کہیں نہ کہیں ایسی عبارتیں ملیں گی جو عورت کے متعلق اس تخیل کی چغلی کھا جائینگی" (صفحہ ۹۵-۱۹۴)

اس کی وجہ ؟

"اسکی وجہ یہ ہے کہ یہاں انقلابی اصول ایک نہایت اہم صورتِ واقعی سے ٹکرا جاتے ہیں، یعنی اس حقیقت سے کہ حیاتیات (Biology) کے اعتبار سے دونوں صنفوں کے درمیان مساوات نہیں ہے، اور دونوں پر مساوی بار نہیں ڈالا گیا ہے" (صفحہ ۷۷)

ایک اقتباس اور دیکھ لیجیے، پھر نتیجہ آپ خود نکال لیں گے :-

"سچی بات تو یہ ہے کہ تمام عمّال (Workers) میں صنفی انتشار (Sexual anarchy) کے آثار نمایاں ہو چکے ہیں - یہ ایک نہایت پرخطر حالت ہے جو سوشلسٹ نظام کو تباہ کر دینے کی دھمکی دے رہی ہے - ہر ممکن طریقہ سے اسکا مقابلہ کرنا چاہیے، کیونکہ اس محاذ پر جنگ کرنے میں بڑی مشکلات ہیں - میں ہزارہا ایسے واقعات کا حوالہ دے سکتا ہوں جن سے ظاہر ہوتا ہے کہ شہوانی بے قیدی (Sexual licentiousness) نہ صرف ناواقف لوگوں میں بلکہ طبقۂ عمال کے نہایت اعلیٰ تعلیم یافتہ اور عقلی حیثیت سے ترقی یافتہ افراد میں بھی پھیل گئی ہے۔" (صفحہ ۲۰۲-۳)

ان عبارتوں کی شہادت کیسی کھلی ہوئی شہادت ہے - ایک طرف یہ اعتراف ہے کہ عورت اور مرد کے درمیان خود فطرت نے مساوات نہیں رکھی، عملی زندگی میں بھی مساوات قائم کرنے کی کوششیں کامیاب نہیں ہوئیں، اور جس حد تک فطرت سے لڑ کر اس قسم کی مساوات قائم کی گئی اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ فواحش کا ایک سیلاب امنڈ آیا جس سے سوسائیٹی کا سارا نظام خطرہ میں پڑ گیا - دوسری طرف یہ دعویٰ ہے کہ نظام اجتماعی میں عورت کے حقوق پر کسی قسم کی حد بندیاں نہ ہونی چاہئیں اور اگر ایسا کیا جائے گا تو ہم اسکی سخت مخالفت کرینگے - اس سے بڑھ کر اور کیا ثبوت اس امر کا ہوگا کہ انسان ـــــ جاہل نہیں بلکہ عالم، عاقل، نہایت باخبر انسان بھی ـــــ اپنے نفس کے رجحانات کا اتنا غلام ہوتا ہے کہ خود اپنی تحقیق کو جھٹلاتا ہے، اپنے مشاہدات کی نفی کرتا ہے، اور سب طرف سے آنکھیں بند کر کے ہوائے نفس کے پیچھے ایک ہی رخ پر انتہا کو پہنچ جاتا ہے، خواہ اس افراط کے خلاف اسکے اپنے علوم کتنی ہی محکم دلیلیں پیش کریں، اسکے کان کتنے ہی واقعات سُن لیں، اور اسکی آنکھیں کتنے ہی برے نتائج کا مشاہدہ کر لیں - اَفَرَءَيْتَ مَنِ اتَّخَذَ اِلٰهَهٗ هَوٰىهُ وَاَضَلَّهُ اللّٰهُ عَلٰى عِلْمٍ وَّخَتَمَ عَلٰى سَمْعِهٖ وَقَلْبِهٖ وَجَعَلَ عَلٰى بَصَرِهٖ غِشٰوَةً فَمَنْ يَّهْدِيْهِ مِنْۢ بَعْدِ اللّٰهِ اَفَلَا تَذَكَّرُوْنَ (الجاثیہ : ۳)

قانون اسلام کی شان اعتدال بے اعتدالی اور افراط و تفریط کی اس دنیا میں صرف ایک نظام تمدن ایسا ہے جس میں غایت درجہ کا اعتدال اور توازن پایا جاتا ہے۔ جس میں فطرت انسانی کے ایک ایک پہلو حتی کہ نہایت خفی پہلو کی بھی رعایت کی گئی ہے، انسان کی جسمانی ساخت، اور اس کی حیوانی جبلت، اور اس کی انسانی سرشت، اور اس کی نفسی خصوصیات، اور اسکے فطری داعیات کے نہایت مکمل اور تفصیلی علم سے کام لیا گیا ہے، اور ان میں سے ایک ایک چیز کی تخلیق سے فطرت کا جو مقصد ہے اس کو تمام و کمال اس طریقہ سے پورا کیا گیا ہے کہ کسی دوسرے مقصد حتی کہ چھوٹے سے چھوٹے مقصد کو بھی نقصان نہیں پہنچتا، اور بالآخر یہ سب مقاصد مل کر اُس بڑے مقصد کی تکمیل میں مددگار ہوتے ہیں جو خود انسان کی زندگی کا مقصد ہے۔ یہ اعتدال، یہ توازن، یہ تناسب اتنا مکمل ہے کہ کوئی انسان خود اپنی عقل اور کوشش سے اس کو پیدا کر ہی نہیں سکتا۔ انسان کا وضع کیا ہوا قانون ہو اور اس میں کسی جگہ بھی یک رخی نہ ظاہر ہو، ناممکن! قطعی ناممکن!! خود وضع کرنا تو درکنار، حقیقت یہ ہے کہ معمولی انسان تو اس معتدل و متوازن اور انتہائی حکیمانہ قانون کی حکمتوں کو پوری طرح سمجھ بھی نہیں سکتا جب تک کہ وہ غیر معمولی سلامت طبع نہ رکھتا ہو اور اس پر سالہا سال تک علوم اور تجربات کا اکتساب نہ کرے اور پھر برسوں غور و خوض نہ کرتا رہے۔ میں اس قانون کی تعریف اسلیے نہیں کرتا ہوں کہ میں اسلام پر ایمان لایا ہوں، بلکہ دراصل میں اسلام پر ایمان لایا ہی اس وجہ سے ہوں کہ مجھے اس میں کمال درجہ کا توازن اور تناسب اور قوانین فطرت کے ساتھ تطابق نظر آتا ہے جسے دیکھ کر میرا دل گواہی دیتا ہے کہ یقیناً اس قانون کا واضع وہی ہے جو زمین و آسمان کا فاطر اور غیب و شہادت کا عالم ہے، اور حق یہ ہے کہ مختلف سمتوں میں بہک جانے والے بنی آدم کو عدل و توسط کا محکم طریقہ وہی بتا سکتا ہے۔ قُلِ اللّٰهُمَّ فَاطِرَ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ عٰلِمَ الْغَيْبِ وَالشَّهَادَةِ اَنْتَ تَحْكُمُ بَيْنَ عِبَادِكَ فِيْمَا كَانُوْا فِيْهِ يَخْتَلِفُوْنَ (الزمر: ۵)